بسم الله الرحمن الرحيم

قرآن کی نظر میں اہل بیت
کی
منزلت

مؤلف:
ڈاکٹر مجید معارف

مترجم:
سید احمد حسین حسینی

کتاب کا نام: قرآن کی نظر میں اہل بیت کی منزلت
مؤلف: ڈاکٹر مجید معارف
مترجم: سید احمد حسین حسینی
نظر ثانی: سید مبین حیدر رضوی
پبلشر: موسسہ فرہنگی ہنری مشعر
ایڈیشن: فروری ۲۰۱۵ء
تعداد:
قیمت:
مشعر کے ہول سیلرز:
تہران: ٹیلیفون نمبر: ۶۴۵۱۲۰۰۳ ـ ۰۲۱
قم: ٹیلیفون نمبر: ۳۷۸۳۸۴۰۰ ـ ۰۲۵

فہرست

مقدمہ ۷

ائمہؑ کے بارے میں سوالات کا تاریخی پس منظر: ۹

چند اجمالی باتیں قرآن کے بارے میں: ۱۲

سیاسی اور سماجی پس منظر قرآن میں: ۱۵

تاریخی آیات کی تفہیم اوراسباب نزول کی اہمیت: ۱۸

قرآن میں اہل بیت علیہم السلام کی شخصیات: ۲۲

۱۔ ہجرت کا آغاز اور عظیم قربانی: ۲۴

۲۔ مباہلہ اور رسول خداؐ کا خاندان مبارکؑ ۲۷

۳۔ قرآن کی نظر میں صاحبان امر: ۲۹

۴۔ولایت کے سائے میں دین کی تکمیل: ۳۳

۵۔ولی اور مومنوں کے سرپرست: ۳۷

۶۔ آخری فرمان کا ابلاغ اور رسالت کی تکمیل: ۴۰

۷۔ مشرکین سے بیزاری کا اعلان: ۴۶

۸۔ایمان اور جہاد کا پیشرو: ۴۹

۹۔ پہلی دعوت میں وصی کا تعین: ۵۱

۱۰۔ قرآن حکیم میں اہل بیتؑ کا تذکرہ: ۵۴
۱۱۔اجر رسالت: ۵۶
۱۲۔ راہ خدا میں خرچ کرنے کی مخصوص فضیلت: ۵۹
۱۳۔ قربانی کی عظمت: ۶۳
۱۴۔بہترین مخلوق: ۶۵
۱۵۔اولاد کثیر اور بقائے نسل: ۶۷

مقدمہ

اہل تشیع اور اہل سنت کی کتابوں میں ایک معروف حدیث منقول ہے جس کی صحت کے بارے میں کسی کو شک و شبہ نہیں۔ اس حدیث میں یہ ذکر ہوا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو بڑی امانتیں یادگار کے طور پر اپنی امت کے سپرد کی ہیں: قرآن اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی ہدایت انہیں دونوں امانتوں سے رجوع کرنے سے مشروط بتائی ہے۔ بے شک پرہیزگاروں کی ہدایت کا واحد ذریعہ قرآن کریم ہے کیونکہ یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک واضح نشانی ہے جو ہمیشہ مسلمانوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

تو پھر یہ اہل بیت علیہم السلام کون لوگ ہیں اور سیاسی اور معنوی نقطہ ہائے نگاہ سے ان کی کیا قدر و منزلت ہے کہ حدیث ثقلین میں قرآن کی ہدایت کا ذکر ان اشخاص کی رہنمائی کے ساتھ آیا ہے۔ اس تحریر کا مقصد دراصل قرآن اور معتبر روایات (جن کا ذکر قرآنی آیات کی شان نزول یا ان کی تشریحات کے لئے کیا گیا ہے) کی روشنی میں اہل بیت کی سچائی سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے۔ مزید برآں یہ تحریر بالخصوص امام علی علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کے بارے میں قرآن کے نقطہ نظر کی کی تشریح سے متعلق بحث کرتی ہے۔ ان مباحث کی اہمیت

اس وقت واضح ہو گی جب ہم درج ذیل دو باتوں کو ذہن نشین کر لیں گے:

۱۔ امامت کا شمار سب سے اہم اعتقادی اصولوں میں ہوتا ہے۔

۲۔ ائمہ کے اسمائے گرامی قرآن کریم میں نہیں آئے۔

ائمہؑ کے بارے میں سوالات کا تاریخی پس منظر:

بعض روایات کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ سے متعلق بحث عرصہ دراز سے مسلمانوں کے درمیان رائج رہی ہے۔ مثال کے طور پر کلینی (رح) اپنی کتاب کافی میں ابو بصیر سے روایت کرتے ہیں کہ ابو بصیر کہتے ہیں: ''میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم"[1] کی آیت کن لوگوں کے لئے نازل ہوئی؟"

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''یہ آیت حضرت علی علیہ السلام اور ان کے دو بیٹوں حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی''۔

ابو بصیر کہتے ہیں: میں نے دوبارہ سوال کیا: '' لوگ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے مبارک خاندان کے ناموں کا تذکرہ قرآن میں کیوں نہیں کیا؟"

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لوگوں کو یوں جواب دو: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صرف نماز پڑھنے کا حکم نازل ہوا یہ بتائے بغیر کہ رکعتوں کی تعداد کتنی ہو۔ یہ رسول اللہؐ تھے جنہوں نے نماز کی رکعات کا تعین فرمایا۔ زکات کا

۱۔ النساء، ۵۹

حکم تو نازل ہوا لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ ہر چالیس درہم پر ایک درہم زکات دی جائے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جنہوں نے زکات کی رقم کا تعین فرمایا۔ حج کا حکم تو خدا کی طرف سے نازل ہوا لیکن اس میں نہیں بتایا گیا کہ سات مرتبہ خانہ خدا کا طواف لازمی ہے۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی تھے جنہوں نے طواف کی رسومات کی توجیہہ و تشریح فرمائی۔ اسی بنیاد پر خدا کا حکم نازل ہوا کہ "اللہ کی اطاعت کرو، رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو" جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام، حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کے بارے میں شہادت دے رہی ہے

پس اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **"جس کا میں مولا ہوں، اس کا علی مولا ہوگا"** پھر فرماتے ہیں: "میں تم مومنین کو آگاہ کر رہا ہوں کہ خدا کی کتاب اور میرے خاندان کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا، کیونکہ میں نے خدا سے دعا مانگی ہے کہ قرآن اور میرا خاندان کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں جب تک کہ دونوں قیامت کے دن حوض کوثر کے کنارے مجھ سے نہ مل جائیں، اور خدا نے میری دعا قبول فرمائی" ۔۔۔۔ پس جان لو کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنے خاندان کا تعارف نہ فرماتے تو کل کو کوئی اور خاندان دعوی کرنے لگ جاتا کہ ہم تمہارے صاحب الامر ہیں"[1]

ملاحظہ کیجئے کہ اس حدیث میں امام صادق علیہ السلام ابو بصیر کے

۱۔ الکافی، ۱/۲۷۸

سوال کے جواب میں ایک اور اہم مطلب کی جانب نیز اشارہ فرمارہے ہیں یعنی جہاں ایک طرف قرآن کی اجمالی طبیعت کا ذکر ہو رہا ہے وہیں دوسری جانب ان اجمالات کو سمجھنے کے لئے قرآن کی تفاسیر اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رجوع کرنے کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نہ صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ علیہم السلام کے اپنے دور بلکہ ہر دور میں لوگوں کی توجہ کا باعث بنتی رہے گی۔

چند اجمالی باتیں قرآن کے بارے میں :

قرآن ایک ایسی کتاب کا نام ہے جس میں مختلف اعتقادی، اخلاقی اور تاریخی موضوعات کا ذکر ہوا ہے۔ یہ وہ کتاب الٰہی ہے جس نے اپنے مخاطبین کو نہایت اہم مفاہیم و مطالب سے آگاہ کیا ہے۔ واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ مختلف مقامات پر قرآن کی آیات کلی اور مختصر ہیں جنہیں مکمل طور پر سمجھنے کے لئے تفاسیر سے رجوع لازمی ہے۔ البتہ اس خاصیت کو کسی بھی صورت میں قرآن کا نقص نہیں کہا جاسکتا[1]۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک کتاب میں خلقت کے تمام اسرار و حقائق پوشیدہ ہوں، اور اس کے موضوعات نہایت تفصیل سے بیان ہوئے ہوں۔ اہمیت صرف اس بات کی ہے کہ انسان فقط یہ سمجھے کہ حکمت خداوندی نے قرآن کی تفسیر اور تبیین کے لئے کیا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے ہمیں درج ذیل باتیں ماننا پڑیں گی:

۱۔ قرآن کا پہلا مفسر اور مبین خود اللہ تعالی کی ذات ہے۔

۲۔ رسول اللہؐ لوگوں کے درمیان قرآن کے مفسر ہیں۔

۱۔ قرآن کی اجمالی طبیعت اور اس خاصیت کے نقص نہ ہونے کے متعلق قرآنی معارف کے علماء یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ائمہ اطہار (علیہ السلام) کی احادیث و اقوال سے رجوع کرنے کے لئے دیکھئے بحار الانوار، ۹۲/۱۰۰

پہلی صورت کی تصدیق کے لئے خداوند تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ * ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ [۱]

ترجمہ: "پھر جب ہم پڑھوا دیں تو آپ اس کی تلاوت کو دہرائیں۔ پھر اس کے بعد اس کی وضاحت کرنا بھی ہماری ہی ذمہ داری ہے"

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن کی آیات کے نزول کے ساتھ ساتھ قرآنی مطالب کی تبیین کے عنوان سے کچھ حقائق بھی نازل ہوئیں۔ اسی لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں سے خطاب فرماتے ہوئے ایک حدیث میں یوں بیان فرماتے ہیں: "الا انی قد اوتیت القرآن ومثلہ معہ" [۲] **یعنی: آگاہ رہو کہ مجھے قرآن اور اس جیسی دوسری حقائق دے دی گئی ہیں۔"**

دوسری صورت میں خداوند متعال نے سورہ نحل میں فرمایا:

أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ [۳]

ترجمہ: "(اے ہمارے رسول! ہم نے) آپ کی طرف بھی ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے تاکہ اس کے لئے ان احکام کو واضح کردیں جو انکی طرف نازل کئے گئے ہیں۔"

رسول اللہؐ اپنے قول و فعل سے قرآن کی وضاحت کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر نماز کی انجام دہی سے متعلق صحابہ کرام سے فرماتے

۱۔ القیامہ، ۱۸۔۱۹

۲۔ سنن ابن ماجہ، ۶/۱، سنن ابی داود، ۴/۲۰۰

۳۔ النحل، آیت نمبر ۴۴

ہیں: "صلوا کما رایتمونی اصلی"[1] یعنی: اسی طرح نماز ادا کرو جس طرح تم مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔"

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا 'فعل' "اقیموا صلوۃ" کی تفسیر کر رہا ہے۔ بعض مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اقوال کے ذریعے قرآن کے اجمالات کی توضیح و تشریح فرمائی ہے جن کے کئی نمونے شیعہ اور سنی علماء کی تفاسیر میں موجود ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اسی خاص روش میں بعض اوقات اپنے دوستوں اور صحابہ کے درمیان مختلف سیاسی اور سماجی پس منظر **(جو یہاں زیر بحث آئیں گے)** میں بعض قرآنی حقائق کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔

۱۔ صحیح بخاری، ۱/۱۷۷

سیاسی اور سماجی پس منظر قرآن میں :

اجتماعی اور سماجی مسائل ان موضوعات میں سے ہیں جن کا تذکرہ جا بجا قرآن میں ملتا ہے۔ قرآن نے انتہائی متنوع مسائل جیسے امر بالمعروف و نہی از منکر، باہمی تعاون، مسلم اتحاد اور بھائی چارے، جنگ اور جہاد، امامت اور رہبری، مظلوم کی پشتیبانی اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کرنے پر روشنی ڈالی ہے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کی گروہ بندی مومنین، منافقین، اہل کتاب اور عناد رکھنے والے دشمنوں کی صورت میں کی ہے اور ان تمام گروہوں کی سماجی اور نفسیاتی خصوصیات سے آگاہ کیا ہے۔ قرآن میں آنے والے اکثر سماجی پس منظر سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کی سیاسی تبدیلیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ البتہ قرآن حکیم ان حوادث کا بیان کچھ اس پیرائے میں کرتا ہے کہ اشخاص اور حوادث کے مرکزی کرداروں کے ناموں کا تذکرہ کئے بغیر، صرف حادثے اور اس سے متعلق خصوصیات کا ذکر آئے۔

دوسرے الفاظ میں قرآن میں جس قدر سماجی واقعات پر توجہ دی گئی ہے، اس قدر ان واقعات کے کرداروں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاصر افراد میں ابولہب وہ واحد شخص ہے جس کی قرآن میں نہ صرف یہ کہ کھُلے الفاظ میں مذمت کی گئی ہے بلکہ اس کا نام بھی آیا ہے۔

سوال اٹھتا ہے کہ قرآن کریم میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاصر افراد کا ذکر مبہم اور اجمالی طور پر کیوں ہوا ہے؟ اس کے بہت سارے اسباب ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس سے قرآن کے تربیتی اہداف ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ طریقہ قرآن کی جاوداں طرزِ نگارش کا ثبوت پیش کرتا ہے اور اس کی آیات مخصوص لوگوں تک محدود ہو کر نہیں رہ جاتیں۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: "اگر ایک قوم کے ختم ہو جانے کے بعد اس کی شان میں نازل ہونے والی آیت بھی فنا ہو جائے، تو پورا قرآن ہی ختم ہو جائے۔ لیکن جب تک آسمان اور زمین باقی ہیں، قرآن بھی باقی رہے گا اور ہر قوم کے لئے اس میں ایک ایسی آیت ہے جسے وہ پڑھتے ہیں اور اس سے اچھا اور برا استفادہ کرتے ہیں۔"[1]

پھر بھی تاریخ اسلام سے بہتر آشنائی کے پیش نظر اور ان افراد و عناصر کی شناخت کے لئے جو نزول قرآن کے زمانے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا باعث بنے، اسلامی سکالرز بالخصوص قرآن کے مفسرین کبھی بھی ان افراد اور واقعات سے غافل نہیں رہے جن کے لئے کوئی آیت یا آیات نازل ہوئیں۔ اس کے لئے انہوں نے دو علوم کی بنیاد رکھی ہے جن کے ریشے تاریخی اقوال و روایات سے جا ملتے ہیں۔

ان دو علوم میں سے ایک کا نام قرآن کے ابہامات کا علم[2] ہے جو قرآنی واقعات میں آنے والے افراد و اشخاص اور نزول کے زمانے میں

۱۔ تفسیر عیاشی ۱/۲۱

۲۔ الاتقان، سترویں قسم

رونما ہونے والے حوادث سے بحث کرتا ہے۔ دوسرے علم کا نام اسباب النزول کا علم ہے جس میں ان شرائط کا مطالعہ اور تحقیق کی جاتی ہے جو کسی آیت یا آیات کے نزول کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ یہ ایک طبیعی امر ہے کہ ایک ایسے شخص کے لئے جو بالخصوص قرآنی نقطہ نگاہ سے تاریخی واقعات سے مکمل آگاہی کا خواہاں ہے، قرآن کے ابہامات اور قرآنی آیات کے نزول کے اسباب سے شناسائی نہایت لازمی ہے۔

تاریخی آیات کی تفہیم اور اسباب نزول کی اہمیت:

قرآنی علوم کے ماہرین عصر نزول کی شرائط کے پیش نظر قرآن پاک کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

الف: وہ آیات جو کسی سوال، حادثہ یا واقعہ کے سبب نازل ہوئیں.

ب: وہ آیات جو پہلے پہل لوگوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے نازل ہوئیں اور جن کا کسی حادثے یا واقعے سے کوئی تعلق نہیں.

ظاہر ہے کہ **"اسباب النزول"** نامی علم کا تعلق پہلی قسم سے ہے اور قرآن میں ایسی بے شمار آیات ہیں جو کسی حادثے یا واقعے کے نتیجے میں نازل ہوئیں. اس لئے ایسی آیات ان حوادث اور افراد اور گروہوں سے آگاہی کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں جو حوادث و واقعات کی رونمائی کے وقت موجود تھے. چنانچہ ایسے حوادث و واقعات کسی بھی شخص کے لئے قرآنی آیات کی بہتر تفہیم میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اور اسے آیات کی فرضی اور SYMBOLIC توضیح و تشریح سے باز رکھتے ہیں.

مثال کے طور پر اگر ہم سورہ کوثر کے سبب نزول پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مکہ میں عاص بن وائل نامی ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برائی کرتا تھا. یہ ملعون آپ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کا مذاق اڑایا کرتا تھا اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، وہ ملعون آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابتر (جس کی نسل ختم ہو چکی ہو) کہہ کر پکارتا تھا.

چنانچہ اب اگر ہم اسی سبب نزول ذہن میں رکھتے ہوئے سورہ کوثر کی تلاوت کریں تو صاف ظاہر ہوگا کہ یہاں "کوثر" سے مراد بی بی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ذات مبارکہ ہے. کیونکہ اس مختصر سے سورہ کی اوپری اور نچلی آیات ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتیں. اسی طرح اکثر آیات کے سبب نزول کو دیکھ کر اس دور کے لوگوں کی خصوصیات اور واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے. مزید برآں اس سے اسلام کے ابتدائی دنوں میں عرب معاشرے میں موجود گروہوں سے بھی آشنائی حاصل ہو جاتی ہے.

یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ دوسری قسم کی آیات میں ایسی بہت سی آیات کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو مذکورہ معنوں میں کوئی خاص سبب نزول نہیں رکھتیں، لیکن ان کے بارے میں پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہ السلام کی ایسی روایات بیان ہوئی ہیں جن سے آگاہی کے بعد پڑھنے والے کو ان آیات کے پس منظر میں موجود لوگوں اور حوادث کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے. مثال کے طور پر آیہ تطہیر کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام علی علیہ السلام، بی بی فاطمہؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو جمع فرمایا اور ان کے حق میں دعا فرما کر لوگوں کو یہ سمجھایا کہ آیت میں موجود **"اہل بیت"** سے مراد ان لوگوں کے علاوہ کوئی اور نہیں۔

قرآن کی صحیح تفہیم کے لئے سبب نزول سے آگاہی کی اہمیت کے پیش نظر حضرت علی علیہ السلام ایک مقام پر اپنے تعارف کے لئے فرماتے ہیں:

"مجھ سے سوال کرو، خدا کی قسم تم مجھ سے کسی ایسی چیز کے بارے میں نہیں پوچھوگے، مگر یہ کہ میں تمہیں اس چیز سے آگاہ کروں. خدا کی کتاب کے بارے میں مجھ سے پوچھو. خدا کی قسم، ایسی کوئی آیت نہیں مگر یہ کہ میں جانتا ہوں کہ رات کے وقت نازل ہوئی یا دن کے وقت، صحرا میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر."[1]

اسی طرح فرماتے ہیں:

"کوئی آیت نہیں، مگر یہ کہ میں جانتا ہوں کہ کس موضوع سے متعلق اور کہاں نازل ہوئی."[2]

جہاں سبب نزول کی شناخت انتہائی اہمیت کی حامل ہے، وہیں یہ کوئی ایسا موضوع نہیں جس میں انسان کی اپنی جدوجہد، پسند ناپسند، یا اس کے اپنے قرینے اور سلیقے کو مداخلت کی اجازت ہو. قرآن کے ابہامات اور آیات کے سبب نزول سے آشنائی صرف اقوال اور تاریخی روایات کے مطالعے کے بعد ہی ممکن ہے. وہ بھی صحیح اور تسلی بخش اقوال و روایات کا مطالعہ. کیونکہ دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح یہاں بھی سینکڑوں جھوٹے اور از خود ساختہ اقوال و روایات موجود ہیں جن کا مقصد صرف اور صرف تاریخ اسلام میں آنے والے بعض جھوٹے

۱۔ الاتقان ۴/۲۳۳

۲۔ الاتقان ۴/۲۳۳

افراد اور گروہوں کو زمانے کی نگاہوں اونچا مقام عطا کرنا ہے.

بہر حال محققین کو ائمہ اطہار (علیہ السلام) کی روایات اور پہلے دور کے صحابہ کی زبانی مختلف آیات کے صحیح سبب نزول کے مطالعے کے بعد کسی حد تک تاریخ اسلام سے متعلق حقائق آشکار کرنے میں کامیابی ملی ہے جن میں سب سے اہم حقیقت اہل بیت علیہم السلام کے مقام کی شناخت ہے۔

قرآن میں اہل بیت علیہم السلام کی شخصیات :

بے شک قرآن میں آنے والی سینکڑوں آیات ایسی ہیں جن میں اہل بیت علیہم السلام کے اونچے درجے اور بلند مقام کی طرف اشارہ ہوا ہے بالکل اسی طرح جس طرح حضور صلی االلہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کے دشمنوں اور مخالفین کا مختلف آیات میں تذکرہ آیا ہے. لیکن ان آیات کا صحیح ادراک اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان کے اسباب نزول سے منسوب صحیح روایات کا مطالعہ کریں. دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان آیات کے ذیل میں آنے والی معصومین علیہم السلام کی تشریحات و توضیحات سے رجوع کریں.

خلاصہ یہ کہ ان آیات کا مطالعہ صحیح تاریخی تناظر میں کیا جانا چاہیے. اب دیکھا جائے تو حضرت علی علیہ السلام کی ولایت، آپؑ کے وصی ہونے اور اہل بیت علیہم السلام کے کمالات و مقامات کے بارے میں آنے والی بے شمار آیات ملیں گی. امام محمد باقر علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں: "قرآن کا ایک تہائی حصہ ہماری شان اور ایک تہائی حصہ ہمارے دشمنوں کی مذمت میں نازل ہوا ہے. "[1]

ذیل میں آیہ ولایت یعنی سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۶۸ تفاسیر میں یوں

۱۔ تفسیر عیاشی، ۱/۲۱

بیان ہوئی ہے:

"یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے رکوع کی حالت میں سائل کو اپنی انگوٹھی عطا کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔"[۱]

اسی طرح آیہ مباہلہ کے نام سے معروف سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۶۱ میں یوں بیان ہوا ہے:

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام علی علیہ السلام، بی بی فاطمہ علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے ساتھ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ (لعن طعن) کرنے لگے جبکہ اہل بیت علیہم السلام کے علاوہ آپؐ کے ہمراہ کوئی نہ تھا۔"[۲]

ایسی ہی اور بہت سی آیات ہیں جو انسان کو اہل بیت علیہم السلام کی سیاسی اور معنوی کردار سے آگاہ کرتی ہیں اس شرط کے ساتھ کہ ان آیات کا پڑھنے والا ان کے سبب نزول اور تفسیر سے مکمل طور پر آگاہی رکھتا ہو۔ پس اس بحث میں پڑے بغیر کہ پہلے پہل امام علی علیہ السلام اور اہل بیت (علیہ السلام) کے اسمائے گرامی قرآن میں آئے اور پھر تحریف کی وجہ سے ہٹا دیئے گئے ہمارا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ آیات کی تشریحات اور سبب نزول کے تناظر میں قرآن کا مطالعہ اہل بیت علیہم السلام کے مقام اور کردار کو سمجھنے میں ہمارا ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

اہل بیت علیہم السلام کے مقام کا تعین اس وقت ناممکن ہوگا جب کوئی شخص جان بوجھ کر آیات سے منسلک معتبر روایات اور تاریخی حقائق

۱۔ الکشاف ۱/۶۴۹

۲۔ مجمع البیان، ۲/۷۶۲

سے چشم پوشی کرتے ہوئے صرف قرآنی آیات پر اکتفا کرے جو اپنے آپ میں ایک طرح کی تحریف ہے جسے دیگر الفاظ میں "حسبنا کتاب اللہ" کا نام دیا جاتا ہے.

یہاں ان آیات کا مطالعہ کیا جائے گا جن کا سبب نزول اہل بیت علیہم السلام کی مبینہ فضیلت ہو. ساتھ ہی ایسی آیات کا بھی مطالعہ کیا جائے گا جو نزول کے بعد صرف امام علی علیہ السلام اور اہل بیت علیہم السلام سے مخصوص رہیں.

۱۔ ہجرت کا آغاز اور عظیم قربانی:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ)[1]

"اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اپنے نفس کو مرضی پروردگار کے لئے بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے"

یہ آیت لیلۃ المبیت کے حادثے کے بارے میں نازل ہوا. لیلۃ المبیت وہ رات تھی جب حضرت علی علیہ السلام بستر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سوئے تھے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اطمینان کے ساتھ مکہ سے مدینہ ہجرت کر سکیں. شیعہ مفسرین ائمہ علیہم السلام سے منقول مستند روایات اور بعض صحابہ کے بیانات کی روشنی میں اس آیت کو حضرت علی علیہ السلام سے متعلق جانتے ہیں۔

۱۔ البقرہ، ۲۰۷

مثال کے طور پر عیاشی نے جابر اور جابر نے امام صادق سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ امام فرماتے ہیں: "و من الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضاب اللہ و اللہ روف بالعباد" کی آیت حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی. جس وقت قریش کے کفار حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں تھے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر سکیں، تو ایسے میں علی علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر میں سوئے اور یوں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا.[1]

طبرسی ابن عباس سے روایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ سے مدینہ کی طرف روانگی اور حضرت علی علیہ السلام کے بستر رسولؐ میں سونے کے بعد مکہ اور مدینہ کے راستے میں نازل ہوئی"[2]۔

اہل سنت کے علماء میں بھی کئی ایسے ہیں جن کے مطابق لیلۃ المبیت کی آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی. ایسے علماء میں ابن ابی الحدید کا نام لیا جاسکتا ہے جن کے بارے میں تیسری صدی کے عالم ابو جعفر اسکافی لکھتے ہیں:

"تمام مفسرین یہی روایت کرتے ہیں کہ "و من الناس من یشری" والی آیت حضرت علیؑ کے بستر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سونے

۱۔ تفسری عیاشی، ۱/۱۲۰؛ نیز ملاحظہ ہو تفسیر صافی، ۱/۲۴۱؛ نور الثقلین، ۱/۲۰۴؛ و بحار الانوار، ۳۶/۴۰-۵۰

۲۔ مجمع البیان، ۱/۵۳۵

کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[۱]

اسکافی کا یہ بھی ماننا ہے کہ "لیلۃ المبیت" کی آیت سورہ انفال کی تیسویں آیت سے ایک خاص نسبت رکھتی ہے، جس میں خداوند تعالی فرماتا ہے:

"وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ"

(یاد کرو اس وقت کو جب کفار منصوبہ بنا رہے تھے کہ تمہیں قید میں ڈال دیں، یا جان سے مار ڈالیں، یا مکہ سے نکال باہر کریں، وہ سازش کر رہے تھے اور منصوبے بنا رہے تھے اور خدا بھی تدبیر کر رہا تھا اور خدا سب سے بہتر چارہ جو اور تدبیر کرنے والا ہے۔)

وہ لکھتے ہیں:

"قریش کا منصوبہ تمام عرب قبائل کو حضورؐ کی شہادت میں حصہ دار ٹھہرانے کی کوشش جبکہ خداوند متعال کا منصوبہ علیؑ کو بستر رسولؐ میں سلانے سے ثابت ہوا۔"[۲]

اسکافی کے بقول ابن ابی الحدید مزید برآں کہتے ہیں: حدیث فراش (حضرت علی علیہ السلام کا بستر رسول پر سونا) ایک مسلسل واقعہ ہے جس سے ایک دیوانے کے علاوہ کوئی انکار نہیں کر سکتا"[۳]، اسی لئے معاویہ نے سمرۃ بن جندب کو چار لاکھ درہم کے بدلے یہ کہنے کے لئے راضی

۱۔ شرح نہج البلاغہ، ۱۳/۲۶۲؛ نیز ملاحظہ ہو مفاتیح الغیب، ۵/۲۳۵؛ روح المعانی، ۲/۹۷

۲۔ شرح نہج البلاغہ، ۱۳/۲۶۲

۳۔ ایضاً

کرنے کا فیصلہ کیا کہ "و من الناس من یشری" کی آیت ابن ملجم کے لئے نازل ہوئی ہے. اسمرۃ بن جندب نے ایسا ہی کیا لیکن آیت کے نزول اور حضرت علی علیہ السلام کے ابن ملجم کے ہاتھوں شہادت کے زمانوں کا فاصلہ دیکھ کر چند نادان لوگوں کے علاوہ کسی نے سمرۃ کی روایت پر کان نہیں دھرا.

۲. مباہلہ اور رسول خداؐ کا خاندان مبارکؑ

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَ أَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ [۲]

ترجمہ: پیغمبر علم کے آجانے کے بعد جو لوگ تم سے کٹ حجتی کریں ان سے کہہ دیجئے کہ آؤ ہم لوگ اپنے اپنے فرزند، اپنی اپنی عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو بلائیں اور پھر خدا کی بارگاہ میں دعا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں.

تشریح: دین کی اصطلاح میں مباہلہ کے معنی دو لوگوں کے ایک دوسرے پر لعنت ملامت بھیجنے کے ہیں. مباہلہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ افراد جو آپس میں نظری اختلاف رکھتے ہیں اور اپنے دلائل سے پیچھے نہیں ہٹتے، ایک جگہ جمع ہو کر خدا سے دعا مانگتے ہیں تاکہ وہ جھوٹے کو رسوا کردے. البتہ تاریخ اسلام میں مباہلے کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ:

۱۔ شرح نہج البلاغہ، ۴/۷۳

۲۔ آل عمران، ۶۱

دسویں صدی ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا ایک گروہ مدینہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات اور گفتگو کی. اس ملاقات میں حضرت عیسی علیہ السلام کی ربانیت کے قائل ان عیسائی رہنماؤں نے آپ علیہ السلام کی بغیر ماں باپ پیدائش کا نظریہ باطل اور ناممکن بتایا. جن کے جواب میں (خدا کے سامنے عیسی کی مثال بالکل اسی آدم کی سی ہے جسے خدا نے مٹی سے بنایا اور پھر فرمایا: بن جاؤ اور وہ بن گیا. یہ حقیقت تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، اس لئے اس کی تردید کرنے والوں میں شامل مت ہونا **(کہ عیسی خدا کا خلق کیا ہوا ہے)** کی آیت نازل ہوئی.

اس واضح جواب کے باوجود عیسائی قائل نہ ہوئے. یہاں مباہلہ کی آیت نازل ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خداوند کے حکم کی تعمیل میں انہیں مباہلے کی دعوت دی. طرفین اس بات پر متفق ہوئے کہ اگلے دن مباہلے کے لئے ایک خاص مقام پر جمع ہو جائیں. اگلے دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام علی علیہ السلام، بی بی فاطمہ علیہا السلام، امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے ہمراہ مباہلے کے لئے مقررہ مقام پر پہنچ گئے لیکن عیسائیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ آئے ہوئے لوگوں یعنی اہل بیت علیہم السلام کو دیکھتے ہوئے فوراً اندازہ لگالیا کہ مباہلے کی صورت میں وہ سب اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے. لہٰذا اپنے سب سے بزرگ شخص کے مشورے کے پیش نظر انہوں نے پیمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صلح کرنے اور ٹیکس ادا کرنے کو مباہلے پر ترجیح دی.

مباہلے کے واقعے میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اس آیہ مبارکہ کے مطابق علی علیہ السلام کا تعارف نفس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبکہ حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کا جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹوں کی صورت میں ہوا ہے. اسی لئے شیعی رہنمائوں (**اماموں**) نے مخالفین کے سامنے ہمیشہ مباہلہ کی آیت کو دلیل بنا کر اپنا تعارف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولادوں کے طور پر کیا ہے.

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، مباہلہ تاریخ اسلام کا ایک قطعی اور متواتر واقعہ ہے جسے آج تک نہ کوئی جھٹلا سکا ہے اور نہ کسی نے مباہلہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کی تعداد میں کمی بیشی کی ہے. اس حادثے کا ذکر شیعہ اور سنی علماء کی تحریر کردہ متعدد کتب حدیث میں آیا ہے.[1]

۳. قرآن کی نظر میں صاحبان امر:

يا أَيُّهَا الَّذينَ آمَنُوا أَطيعُوا اللَّهَ وَأَطيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنازَعْتُمْ في شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْويلا [2]

ترجمہ: ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول اور صاحبان امر کی

۱۔ ملاحظہ کریں مجمع البیان ۱/۷۶۲؛ تفسیر کشاف، ۱/۳۶۹؛ تفسیر القرآن العظیم، ۱/۳۷۹ و صحیح مسلم، ۴/۱۸۷

۲۔ النساء، ۵۹

اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو. یہی تمہارے حق میں خیر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے.

مندرجہ بالا آیہ شریفہ میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے بعد اولوالامر مومنین کی اطاعت کا بیان ہوا ہے اور یہ کوئی مشروط اطاعت نہیں. مفسرین کے درمیان اس بات پر کہ یہ اولوالامر کون لوگ ہیں، اختلاف نظر پایا جاتا ہے. اہل سنت شیعی نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے اولوالامر سے خلفائے اربعہ (چار خلفاء) ، سیاسی امراء، فوجی افسران اور علمائے دین مراد لیتے ہیں.[1] جبکہ شیعہ مفسرین کے عقیدے کے مطابق مندرجہ بالا افراد میں سے کوئی بھی آیت اولوالامر کا مصداق نہیں. دلیل کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اولوالامر کی اطاعت کا ذکر مطلقاً خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ آیا ہے اور ایسے لوگ معصومین علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتے.

عام مفسرین کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کے ذکر کے بعد طبرسی اولوالامر کا تعین کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں: "ہمارے اصحاب (شیعیان) نے امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اولوالامر وہی پیغمبر کے خاندان

۱۔ ملاحظہ ہو جامع البیان ۵/۹۵، الکشاف، ۱/۵۲۴؛ روح المعانی، ۴/۹۶؛ تفسیر مراغی، ۲/۷۳؛ معالم التنزیل، ۱/۴۴۵؛ و تفسیر القرآن العظیم، ۱/۵۲۹

والے ہیں جن کی اطاعت خداوند متعال نے مطلّقا واجب ٹھہرائی ہے جس طرح اس بے نظیر ہستی نے اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت واجب قرار دی. اس کے علاوہ بھی یہ جائز نہیں کہ خدا کسی کی اطاعت مطلّقا جائز ٹھہرائے مگر اس انسان کی اطاعت جس کی پاکیزگی ثابت شدہ اور باطن اور ظاہر میں کوئی فرق نہ ہو اور وہ ہر طرح کی برائی اور غلطی سے مبرا اور دور ہو. یقیناً امراء اور دانشمند اس میزان پر پورا نہیں اتر سکتے. اس لئے بعید ہے کہ خداوند حکیم کسی گناہگار اور دوغلے انسان کی اطاعت کا حکم جاری فرمائے."[1]

علمائے اہل سنت کے درمیان فخر رازی وہ شخص ہے جو واضح طور پر پاکیزگی کو اولوالامر کی اطاعت مطلق کی لازمی شرط قرار دیتے ہیں. ہر چند نتیجہ اخذ کرتے وقت یہ دانشمند بھی خطا کا مرتکب ہوا ہے.[2]

زمخشری اپنی تفسیر میں صاحبان حق سے مراد امرائے حق لیتے ہیں، لکھتے ہیں: ظالم حکام جن سے خداوند اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، کبھی بھی لائق اطاعت نہیں ہو سکتے. نہ ہی ان کے نام خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے مبارک کے ساتھ آسکتے ہیں.[3]

جیسا کہ بیان کیا جاچکا، شیعہ روایات واضح طور پر اولوالامر کا تعین کرتی ہیں۔

۱۔ مجمع البیان ۳/۱۰۰

۲۔ مفاتیح الغیب، ۱۰/۱۴۴

۳۔ الکشاف، ۱/۵۲۴

مثال کے طور پر کلینی اپنی کتاب میں ابو بصیر سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں کہ ابو بصیر کہتے ہیں: ''میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم"[1] کی آیت کن لوگوں کے لئے نازل ہوئی؟"

امام علیہ السلام نے فرمایا: ''یہ آیت حضرت علی علیہ السلام اور ان کے دو بیٹوں حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی.''

ابو بصیر کہتے ہیں: میں نے دوبارہ سوال کیا: '' لوگ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے مبارک خاندان کے ناموں کا تذکرہ قرآن میں کیوں نہیں کیا؟"

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لوگوں کو یوں جواب دو: حضورؐ پر صرف نماز پڑھنے کا حکم نازل ہوا یہ بتائے بغیر کہ رکعات کی تعداد تین ہونی چاہیے یا چار. یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جنہوں نے نماز کی رکعات کا تعین فرمایا. زکات کا حکم تو نازل ہوا لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ ہر چالیس درہم پر ایک درہم زکات دی جائے. یہ رسول اللہؐ تھے جنہوں نے زکات کی رقم کا تعین فرمایا. حج کا حکم تو خدا کی طرف سے نازل ہوا لیکن اس میں نہیں بتایا گیا کہ سات مرتبہ خانہ خدا کا طواف کیا جائے. یہ رسول اللہؐ ہی تھے جنہوں نے طواف کی رسومات کی توضیح و تشریح فرمائی. اسی بنیاد پر خدا کا حکم نازل ہوا کہ ''اللہ کی اطاعت کرو، رسول اور صاحبان امر کی اطاعت

۱۔ النساء، ۵۹

کرو" جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام، حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کے بارے میں گواہی دے رہی ہے. پس اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جس کا میں مولا ہوں، اس کا علیؑ مولا ہوگا" پھر فرماتے ہیں:

"میں تم مومنین کو آگاہ کر رہا ہوں کہ خدا کی کتاب اور میرے خاندان کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا، کیونکہ میں نے خدا سے دعا مانگی ہے کہ قرآن اور میرا خاندان کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں جب تک کہ دونوں قیامت کے دن حوض کوثر کے کنارے مجھ سے مل جائیں، اور خدا نے میری دعا قبول فرمائی" .... پس جان لو کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنے خاندان کا تعارف نہ فرماتے تو کل کو کوئی اور خاندان دعوی کرنے لگ جاتا کہ ہم تمہارے صاحب الامر ہیں"[1]

۴. ولایت کے سائے میں دین کی تکمیل:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلامَ دِيناً[2]

آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسندیدہ بنا دیا ہے.

یہ آیت غدیر خم کے واقعے کے فوراً بعد نازل ہوئی، اس آیت اور آیہ

۱۔ الکافی، ۱/۲۷۸؛ مختصراً خلاصے کے ساتھ دیکھئے تفسیر عیاشی، ۱/۲۷۳؛ نور الثقلین، ۱/۴۹۷ الی ۵۰۷؛ و تفسیر الصافی، ۱/۴۶۲ الی ۴۶۵۔

۲۔ المائدہ، ۴

تبلیغ کا مفہوم ایک ہی حقیقت یعنی لوگوں تک فرمان خدا کے ابلاغ اور عدم ابلاغ کی صورت میں رسالت الٰہی کے ناقص رہ جانے کی علامت ہے. اس آیت میں خدا کے دین کی تکمیل اور نعمت الٰہی کے مکمل ہونے کی خبر دی گئی ہے. لہٰذا ان دو باتوں کا آپس میں گہرا ربط ہے جو کسی بھی تدبر کرنے والے شخص سے پوشیدہ نہیں. تمام شیعہ اور بعض سنی مفسرین نے اس باہمی رابطے کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی کتابوں میں ان کا ذکر کیا ہے. مثال کے طور پر طبرسی لکھتے ہیں:

"امامین صادقین (محمد باقر اور جعفر صادق علیہما السلام) سے نقل ہونے والی روایات کے مطابق آیہ اکمال کا نزول غدیر خم کے موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امام علی علیہ السلام کو لوگوں کا پیشوا اعلان فرمانے کے بعد ہوا. روایات میں یوں بیان ہوا ہے: یہ خدا کی طرف سے انجام پانے والا آخری فریضہ تھا جس کے بعد کسی اور فریضے کی خبر آسمان سے نہیں اتری. اس کے بعد طبرسی ابوسعید خدری سے نقل شدہ ایک روایت کا ذکر کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت کے نزول کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ اکبر علی اکمال الدین و اتمام النعمة و رضا الرب برسالتی و ولایة علی بن ابی طالب من بعدی و قال من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ."[1]

۱۔ مجمع البیان، ۲۴۶/۳؛ ملاحظہ کیجئے تفسیر عیاشی، ۳۲۱/۱؛ تفسیر تبیان، ۴۳۵/۳، المیزان ۵ / ۲۷۸ الی ۲۸۳ و ۲۹۹ الی ۳۱۰؛ والغدیر ۱۱۵/۲ الی ۱۳۷

مفسرین اہل سنت کا خیال غالبا یہ ہے کہ آیہ اکمال عرفہ کے دن حجتہ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی اور اس آیت کا نزول چند ایک مسائل جیسے حلال و حرام سے متعلق آخری احکام کے ابلاغ یعنی دوسرے الفاظ میں شریعت کی تکمیل، خانہ خدا کی شرک اور بت پرستی سے نجات اور وہاں سے مشرکین کے نکال باہر کرنے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے توسط سے حج کے مناسک کی انجام دہی کے بیان کے بعد ہوا جو کفار کے مسلمانوں پر دوبارہ غلبے کی تضعیف کا باعث بنی.[1]
پھر بھی چند دلائل کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ آیہ اکمال کے نزول کے بارے میں یہ احتمالات درج ذیل حقائق و بیانات کی روشنی میں کمزور اور نادرست ہیں:

۴/۱ ـ اہل سنت کے بہت سے محققین غدیر خم کے واقعے اور آیہ اکمال کے درمیان پائے جانے والے تعلق کو مانتے ہیں یا کم از کم انہوں نے اسے ایک واقعے کے طور پر اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے کہ علامہ امینی نے اہل سنت کی کتابوں میں سے ایسی سولہ (۱۶) کتابوں کا حوالہ دیا ہے.[2]

۴/۲ ـ اہل سنت کی کتابوں میں مذکور اکثر موضوعات جن کا بیان دین کے کامل ہونے کی بحث کے ساتھ آیا ہے یا تو اتنی اہمیت کے حامل نہیں کہ ان کا دین کی تکمیل سے کوئی تعلق بنایا جاسکے یا پھر وہ مسائل ہیں جو آیہ اکمال کے نزول سے کئی سال پہلے حل ہو چکے تھے جیسے گوشت

---

۱ ـ جامع البیان، ۱۶/۸۰؛ فتح القدیر، ۹/۶؛ تفسیر مراغی، ۵۴/۶
۲ ـ الغدیر، ۱۱۶/۱۲ الی ۱۲۵، اور المراجعات، ۱۸۸ ضمیمہ ۶۲۷: آیۃ الاکمال۔

کے حلال یا حرام ہونے کی بحث، حلال و حرام الٰہی کا بیان، حج کا بیان، خدا کے گھر کی بتوں سے آزادی کا بیان وغیرہ.

۴/۳ ــ مذکورہ آیہ شریفہ میں دین کی تکمیل کا ذکر ہوا ہے جو کفار کی مکمل مایوسی کی علامت ہے. البتہ کفار کی نامیدی کا مطلب مسلمانوں پر ان کی حکومت کے اختتام اور نفوذ کے خاتمے کے علاوہ کچھ اور نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امت اسلامی میں رہنمائی کی صورتحال سے متعلق ہے.

۴/۴ ــ کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آیہ اکمال کے نزول کے بعد مزید ۸۱ دنوں تک زندہ رہے اور بعض روایات کے مطابق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارھویں ربیع الاول کو رحلت فرمائی[۱] جس سے بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آیہ اکمال کا نزول اٹھاویں ذی الحجۃ کو ہوا.

۴/۵ ــ اکثر شیعہ مفسرین (جن میں علامہ طباطبائی کا نام سر فہرست ہے) آیہ اکمال کے نزول کو سورہ نور کی آیت نمبر ۵۵ میں آنے والے وعدہ الٰہی کی تکمیل سمجھتے ہیں. ہم جانتے ہیں کہ اس آیت میں زمین پر مومنین کی خلافت، دین الٰہی کے قیام اور بندگان صالح کی آسائش اور تحفظ کا ذکر آیا ہے اور یقیناً مومنین کی رہنمائی کے لئے حضرت علیؑ کا قیام ایک ایسی ہی حکومت کا آغاز تھا.[۲]

۴/۶ ــ امام محمد باقرؑ نے حضرت علیؑ کی ولایت کا ذکر آسمان سے

---

۱ ــ الکافی، ۲/۳۲۴

۲ ــ المیزان، ۵/۲۸۳؛ تفسیر نمونہ، ۴/۲۶۸

نازل ہونے والے آخری فریضے کے طور پر کیا ہے.[1] ایک اور روایت کے مطابق دین اسلام پانچ ستونوں پر استوار ہے جو نماز، زکات، حج، روزہ اور ولایت پر مشتمل ہیں.[2] ان تمام روایات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ولایت ایک ایسے فریضے کی مانند ہے جو دیگر تمام فرائض سے زیادہ افضل ہے۔

۵۔ ولی اور مومنوں کے سرپرست:

(اِنَّما وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُولُہ وَ الَّذِینَ آمَنُوا الَّذِینَ یُقِیمُونَ وَ یُؤتُونَ الزَّکاۃَ وَھُم رَاکِعُونَ)[3]

ترجمہ: تمہارے ولی اور سرپرست وہی خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور وہ لوگ جو ایمان لائے، وہی جو نماز بپا کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں.

یہ آیت آیہ ولایت کے نام سے معروف ہے جس کے نزول کے بارے میں شیعہ سنی کتابوں میں یوں آیا ہے: ایک دن ایک فقیر مسجد نبوی میں داخل ہوا اور لوگوں سے مالی مدد کا تقاضا کیا، لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی. حضرت علی علیہ السلام نے (جو رکوع کی حالت میں تھے) فقیر کو اشارے سے سمجھایا کہ وہ آپؑ کی انگوٹھی لے

۱۔ تفسیر عیاشی، ۱/۳۲۱

۲۔ الکافی، ۲/۱۸

۳۔ ایضاً ۲/۱۸، باب دعائم الاسلام روایت ۵

لے. اسی وقت مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی.[۱]

بعض روایات کے مطابق حضرت علی علیہ السلام اس وقت نافلہ اور مستحب نماز ادا فرمارہے تھے.[۲] ابن عباس کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وضو فرمارہے تھے جب "انما ولیکم اللہ و....'' کی آیت نازل ہوئی، آپؐ مسجد کے اندر داخل ہوئے تاکہ دیکھ سکیں کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی. یہاں پہنچ کر آپؐ نے دیکھا کہ وہ انسان حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور نہ تھا[۳]۔

آیہ ولایت کا شمار ان اہم ترین شواہد میں ہوتا ہے جن کی بنیاد پر شیعہ علماء نے امام علیؑ کی بلافصل امامت کا ثبوت فراہم کیا ہے. آیت کے شروع میں "انما" کی سے مراد جس میں خدا اور رسولؐ کے ساتھ زکات دینے والے مومنین کی ولایت کا ذکر آیا ہے شیعہ اور سنی روایات کے مطابق حضرت علی علیہ السلام ہی ہیں، جبکہ دوسرے حصے میں سرپرستی اور رہنمائی کا تذکرہ ہوا ہے جن سے واضح طور پر حضورؐ کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی امامت ظاہر ہوتی ہے۔

شیخ طوسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: یہ آیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی بلافصل امامت کا سب سے بڑا ثبوت ہے، کیونکہ ایک تو آیت میں ذکر ہونے والے "ولی" کے معنی

۱۔ التبیان، ۳/۵۵۹؛ ۱/۳۵۵، تفسیر القرآن العظیم، ۲/۷۴؛ الکشاف، ۱/۶۴۹؛ معالم التنزیل، ۲/۴۹؛ و نیز بحار الانوار، ۳۵/۱۸۳ الی ۲۰۶

۲۔ تفسیر عیاش، ۱/۳۵۵؛ بہ نقل از عمار یاسر

۳۔ بحار الانوار، ۳۵/۲۰۰

اولی اور برتر کے ہیں، دوسرا یہ کہ ثابت ہو چکا ہے کہ "والذین آمنوا" کا مصداق سوائے علی علیہ السلام کے کوئی نہیں. پس ان دو اصولوں کے اثبات کے بعد اس آیہ مبارکہ کی حضرت علی علیہ السلام کی امامت پر دلالت خود بخود واضح ہو جاتی ہے.[1]

آیہ ولایت کے ذیل میں چند سوالات جنم لیتے ہیں جیسے:

یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نماز کے دوران خداوند متعال سے راز و نیاز کی بجائے کسی اور کام میں مشغول ہو جائیں؟

اس سوال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ مسجد میں سائل کی موجودگی اور اس کا دوبارہ مدد کے لئے سوال کرنا فطری طور پر کسی بھی شخص کی توجہ حاصل کرنے کے لئے کافی ہیں. دوسری بات یہ کہ اس وقت امام علی علیہ السلام مستحب نماز ادا فرما رہے تھے اور ایک فقیر کی امداد کا ثواب ہر گز ایسی نماز سے کمتر نہیں.

دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا انگوٹھی کا شمار زکات دینے کے لئے استعمال ہونے والی چیزوں میں ہو سکتا ہے؟

جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے قرآن میں زکات کا مفہوم اس کے شرعی اور اصطلاحی معنوں میں نہیں آیا بلکہ قرآن میں زکات کا مطلب ہے خدا کی راہ میں کسی بھی طرح کی نیکی اور بخشش. زکات کے شرعی معنی نویں ہجری میں معین کئے گئے جس کے ثبوت کے طور پر مستند روایات اور قرآنی آیات پیش کی جاسکتی ہیں.[2] اس لئے "ویوتون الزکاۃ وھم

۱۔ التبیان، ۳/۵۵۹؛ علامہ مجلسی کے استدلال، بحار الانوار، ۳۵/۲۰۳ الی ۲۰۶

۲۔ التوبہ، ۱۰۳؛ نیز الکافی، ۳/۴۹۷

راکعون" کا مطلب حضرت علی علیہ السلام کی فقیر کے ساتھ نیکی ہے. اگلا سوال آیات میں موجود جمع کے صیغے کے استعمال کے بارے میں ہے. وہ بھی اس بارے میں کہ مذکورہ آیت صرف علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے.

اس سوال کے جواب میں مفسرین کے درمیان بحث رہی ہے. زمخشری لکھتے ہیں: اگر کوئی پوچھے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہو جبکہ "الذین" جمع کا صیغہ ہے، تو کہیں گے: اگرچہ یہ آیت ایک فرد خاص کے لئے نازل ہوئی ہے لیکن اس میں جمع کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے تاکہ ایسے کاموں کی طرف دوسرے لوگوں کو بھی ترغیب دی جاسکے اور وہ بھی ایسے کاموں کی انجام دہی کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو حاصل ہونے والے ثواب سے بہرہ مند ہوں."[1]

اگرچہ زمخشری کی بات ٹھیک ہے لیکن تاریخ میں پھر کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جس میں حالت رکوع میں کسی نے زکات دی ہو۔

۶. آخری فرمان کا ابلاغ اور رسالت کی تکمیل:

يا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ ما أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَما بَلَّغْتَ رِسالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكافِرِينَ [2]

۱۔ الکشاف، ۱/۶۴۹

۲۔ المائدہ، ۶۷

ترجمہ: اے پیغمبر! آپ اس حکم کو پہنچا دیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا کہ اللہ کافروں کی ہدایت نہیں کرتا ہے.

مندرجہ بالا آیت میں "بلغ ما انزل الیک من ربک" والے حصے کو آیہ تبلیغ یا آیہ ابلاغ کہا جاتا ہے. شیعہ اور اکثر سنی مفسرین کو اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ یہ آیت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حجتہ الوداع کے سفر کے دوران نازل ہوئی اور اس آیت کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو جانشین مقرر فرمایا."[1]

اکثر مفسرین یوں بیان کرتے ہیں کہ رسول خداؐ کی حجتہ الوداع سے واپسی کے بعد—یہ واقعہ حضور اکرمؐ کی حیات مبارکہ کے آخری سال میں پیش آیا—غدیر خم نامی مقام پر جبرئیلؑ یہ پیغام لے کر آسمان سے اترے: اے پیغمبر! آپ اس حکم کو پہنچا دیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا.

اس آیت کے نزول کے ساتھ ہی حضورؐ نے مسلمانوں کو ٹھہر جانے کا حکم فرمایا اور نماز ظہر ادا کرنے کے بعد لوگوں سے خطاب فرتے

---

۱ ۔ تفسیر قمی، ۱/۱۷۱؛ تفسیر عیاشی، ۱/۳۶۰ الی ۳۶۲؛ التبیان، ۳/۵۸۸؛ مجمع البیان، ۳/۳۴۴؛ الصافی، ۲/۵۱ الی ۷۱؛ مفاتیح الغیب، ۱۲/۵۰؛ غرائب القرآن، ۲/۶۱۶؛ الدر المنثور، ۲/۲۵۹؛ روح المعانی، ۶/۱۹۵

ہوئے دنیا کی بے ثباتی اور اپنی عنقریب رحلت کا ذکر کیا. پھر حدیث تقلین اور اہل بیت علیہم السلام کی حفاظت کی بات ہوئی. اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کا ہاتھ تھاما اور اسے اس انداز سے بلند کیا کہ تمام لوگ بخوبی دیکھ سکیں اور ایسے میں آپؐ نے پوچھا: **"اے لوگو! اہل ایمان میں سے کون سب سے بہتر ہے؟"** لوگوں نے جواب میں کہا: "خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیادہ بہتر جاننے والے ہیں." رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "وہی خدا میرا مولا ہے اور میں مومنین کا مولا ہوں اور ان سب سے زیادہ افضل و برتر ہوں، پس جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے." حضورؐ نے تین بار اور بعض روایات کے مطابق چار بار اپنی بات دہرائی. پھر دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے اور فرمایا:

"اے خدا! علی کے چاہنے والوں کو دوست رکھ اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھ اور اس کے دوستوں کی مدد اور اس کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کر." اس کے بعد لوگ مختلف گروہوں کی صورت میں آگے آنے، علی (علیہ السلام) کی بیعت کرنے اور انہیں مبارک باد دینے لگے.[1]

اوپر بیان کئے ہوئے واقعے کی روشنی میں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "ما انزل الیک" کا مقصد حضرت علیہ السلام کی ولایت کے اعلان کے علاوہ کچھ اور نہ تھا. اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک وحی (جس میں کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی) میں اس بات سے آگاہ کیا جاچکا تھا.

۱۔ الغدیر، ۱۱/۲۹الی ۳۴؛ سیرۃ المصطفیٰ، ۶۹۳؛ تفسیر عیاشی، ۱/۳۶۰

عیاشی ابن عباس اور جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ایک روایت نقل کرتے ہیں: "خدا نے رسول اللہؐ کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ علیؑ کو اپنا جانشین مقرر فرمائیں اور لوگوں کو ان کی ولایت سے آگاہ کریں، مگر رسول اللہؐ کو خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ یہ کہہ کر کہ رسولؐ نے اپنے چچازاد بھائی کی حمایت کی ہے، بغاوت کا اعلان کر دیں. لیکن بالآخر

(یَا أَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَیْکَ مِنْ رَبِّکَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لَا یَهْدِي الْقَوْمَ الْکَافِرِینَ)

والی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر کے دن علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان فرمایا."[1]

لہٰذا آیہ تبلیغ علی علیہ السلام کی بلافصل امامت کی اہم ترین دلیل ہے جس میں اہل حق کے لئے کسی شک و تردید کی گنجائش باقی نہیں رہتی. اس کے باوجود اہل سنت کے بعض مفسرین نے کوشش کی ہے کہ مختلف تاویل کے ذریعے آیہ تبلیغ کے اصل پیغام کو پس پشت ڈال دیں.

مثال کے طور پر بعض کے مطابق آیہ تبلیغ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کے نزول کے ساتھ ہی حضورؐ پر یہ فریضہ عائد ہوگیا کہ وہ کفار اور مشرکین کے درمیان کسی ابہام کے بغیر اسلامی حقائق بیان کریں.[2] ہرچند کہ یہ مفسرین بھی بخوبی جانتے ہیں کہ سورہ مائدہ مدنی سورتوں میں سے ایک ہے جس کا نزول حضورؐ کی زندگی کے آخری دنوں میں

۱۔ ایضاً، ۱/۳۶۰؛ مجمع البیان، ۳/۳۴۴؛ شواہد التنزیل میں حاکم حسکانی کا قول

۲۔ الکشاف، ۱/۶۵۹؛ المنار، ۶/۴۶۷

ہوا. نیز اہل سنت کی اکثر تفسیروں میں آیہ تبلیغ کے بارے میں یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ آیت بھی مدینہ ہی میں نازل ہوئی.[1]

بعض اہل سنت یہ بھی کہتے ہیں کہ اگرچہ آیہ تبلیغ مدینہ میں نازل ہوئی لیکن اس کا ہدف رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہود و نصاری کے درمیان حقائق کے ابلاغ کا حکم دینا تھا.[2] شاید یہ مفسرین اس بات سے بے خبر تھے کہ بنی قریضہ اور خیبر ــ مسلمانوں کی یہودیوں کے خلاف جنگیں لڑیں ــ کے بعد یہودی طاقت ختم ہو کر رہ گئی، جبکہ عرب معاشرے میں مقیم مسیحی شروع ہی سے انتہائی کمزور تھے اور ان کے اور مسلمانوں کے درمیان واحد مقابلہ مباہلے کا واقعہ تھا جو شروع ہوئے بغیر ہی ختم ہو گیا.[3] اس بنا پر رسول خداؐ کی زندگی کے آخری دنوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہود و نصارا کے درمیان حقائق اسلام کے ابلاغ کے بارے میں اندیشے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.

آیہ تبلیغ میں تشکیک کا اہم ترین نقطہ لفظ **"مولا"** ہے. اہل سنت کے بعض مفسرین کا خیال ہے کی حدیث میں حضورؐ کی مولا سے مراد دوست اور یاور ہے کہ **"من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ"** اور یہ لفظ رہبر کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا. تفسیر المنار کے مصنف لکھتے ہیں: حدیث غدیر خم امامت یا خلافت پر مبنی ولایت پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ قرآن میں اس لفظ کا استعمال ان معنوں میں نہیں ہوا. بلکہ اس

---

۱ ـ تفسیر القرآن العظیم، ۲/۸۱؛ البحر المحیط، ۴/۳۲۱؛ مفاتیح الغیب، ۱۲/۵۰

۲ ـ مفاتیح الغیب، ۱۲/۵۰؛ البحر المحیط ۴/۳۲۱؛ التحریر والتنویر، ۶/۲۵۵

۳ ـ آل عمران، ۶۱

حدیث میں ولایت سے مراد نصرت اور مودت کی ولایت ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔"[1]

اس نظریہ پر یہ تنقید کی جاسکتی ہے کہ مولا کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کا استعمال کئی معنوں میں ممکن ہے لیکن حدیث غدیر میں موجود علامات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں لفظ **"مولا"** کا مفہوم 'رہبر' ہی ہے۔ ان متعدد علامات میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

۶/۱ــ صاحب المنار کے نظریے کے برعکس قرآن میں لفظ **"مولا"** کا **"اولی"**[2] کے معنوں میں استعمال۔

۶/۲ ــ حضرت علی علیہ السلام کے تقرر سے قبل آیہ تبلیغ کا "ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ" کے شدید پیغام کے ساتھ نزول۔

۶/۳ ــ غدیر خم کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں مسلمانوں کا پڑاؤ۔

۶/۴ ــ غدیر خم کے مقام پر حضورؐ کا خطاب، اپنی ولایت کا اعلان اور اہل بیت علیہ السلام کے حقوق کے بارے میں احکامات

۶/۵ ــ اس واقعے کے بعد اکمال دین کی آیت کا نزول

۶/۶ ــ واقعہ غدیر میں دوسروں پر اپنی اولویت ثابت کرنے کے لئے حضرت علی علیہ السلام کی دلیل۔

۶/۷ ــ اسلامی تاریخ کے صفحات پر زریں حروف سے لکھے ہوئے واقعہ غدیر کا دوام اور مسلمانوں کے توسط سے اس دن کو بطور عید منانے

۱۔ المنار، ۶/۴۶۵؛ ذرا سے اختصار کے ساتھ

۲۔ الحدید، ۱۵

کی رسم.[1]

۷۔ مشرکین سے بیزاری کا اعلان:

(وَأَذَانٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ)[2]

اور اللہ ورسول کی طرف سے حج اکبر کے دن انسانوں کے لئے اعلان عام ہے کہ اللہ اور اس کے رسول دونوں مشرکین سے بیزار ہیں.

توضیح وتشریح: ہم جانتے ہیں کہ سورہ توبہ بسم اللہ کے بغیر نازل ہوا تاکہ لوگ مشرکین پر غضب الہی سے آگاہ ہو جائیں. اس سورہ کی پہلی دس آیات ایسی ہیں جن میں واضح طور پر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشرکین سے بیزاری کا اعلان کیا گیا ہے. ان آیات کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیات ابوبکر کے حوالے کیں اور اسے مکہ جاکر مشرکین کے اندر جاکر ان آیات کی قرات کا حکم دیا لیکن ابھی ابوبکر مدینہ سے باہر نہیں گئے تھے کہ جبرئیل علیہ السلام خدا کی طرف سے اس پیغام کے ساتھ نازل ہوئے:

(انہ لن یودّی عنک الّا انت او رجل منک)

ترجمہ: "یہ کام آپؐ یا آپؐ کے یا کسی اپنے کے علاوہ کوئی اور انجام نہیں دے گا."

۱۔ تفصیلی منابع اور مطالب کے لئے دیکھئے دار الغدیر، ۲/۸۸ الی ۱۱۴

۲۔ التوبہ، ۳

ایسے میں رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو ابوبکر کے پیچھے روانہ کیا اور حکم دیا کہ وہ ابوبکر سے آیات لے کر خود مکہ چلے جائیں. ابوبکر واپس مدینہ لوٹا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے حاضر ہو کر اس عمل کی وجہ دریافت کی. رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ہدایت میں اس تبدیلی کا حکم خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے.[1]

اہل سنت کے اکثر مفسرین مندرجہ بالا واقعے کی تصدیق کرتے ہیں[2] یہ بزرگ حضرات اپنی تفسیروں میں یوں رقمطراز ہیں کہ مشرکین کے درمیان پہنچنے کے بعد حضرت علیؑ نے سورہ توبہ کی پہلی آیات کی تلاوت کی اور انہیں خدا کی دی ہوئی مہلت سے آگاہ کیا جس کی بنیاد پر مشرکین صرف آئندہ چار مہینوں تک مسجد الحرام کے اندر آجا سکتے تھے. ظاہر ہے کہ ایک ایسا پیغام اور وہ بھی بلند آواز سے مجمع کے اندر سنانا کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا تھا. یہاں اس واقعے کا سب سے اہم نکتہ اس خطرناک کام کی انجام دہی کا حوصلہ ہے جو صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ان کے کسی اپنے کے ذمہ کیا گیا ہے اور "رجل منک" کا مطلب بھی یہی ہے.

اس حقیقت کو مزید واضح طور پر سمجھنے کے لئے یہ ذکر بھی لازمی ہے کہ زمان جاہلیت میں طرفین کے درمیان معاہدے کئے جاتے جن کی بنا پر وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے. مثلاً اگر ایک شخص دوسرے کو

۱۔ بحار الانوار، ۳۵/۲۸۹ الی ۳۱۲، نزول سورہ برائت میں

۲۔ تفسیر القرآن العظیم، ۲/۳۴۶، مفاتیح الغیب، ۱۵/۳۱۸؛ فتح القدیر، ۲/۳۳۴؛ روح المعانی، ۱/۴۴ وغیرہ

مخاطب کرتے ہوئے کہتا: "انت منی وانا منک" تو در اصل وہ اس بات سے دوسرے فریق سے اپنی روحی اور معنوی وابستگی کا اظہار کر رہا ہوتا. اس صورت میں طرفین وعدہ کرتے کہ ضرورت اور خطرے کے وقت ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور اس کام کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے. اور جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ علی علیہ السلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان بھی ایک ایسا ہی معاہدہ طے پایا. اسی لئے علی علیہ السلام ہجرت کی رات بستر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ سوئے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اطمینان قلب کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت فرما سکیں.

اسی طرح علی علیہ السلام نے تمام جنگوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کو اپنا نصب العین سمجھا. شاید یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب اور دوستوں کے بیچ صرف علی علیہ السلام کو اپنا بھائی قرار دیا اور ان کی صلاحیتوں کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا. آخرکار علی علیہ السلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتحاد یہاں تک پہنچا کہ آیہ مباہلہ میں علی علیہ السلام نفس پیمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرار دیے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اختیارات اور صلاحتیوں کے اہل مانے گئے. اس لئے سورہ توبہ کی پہلی آیات میں خداوند متعال فرماتے ہیں: "انہ لن یودی عنک الا انت او رجل منک" اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مشکل کام کے لئے حضرت علی علیہ السلام کا انتخاب کرکے یہ دکھایا کہ وہ

کون ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ انہیں کی طرح کام انجام دے سکتا ہے۔[1]

۸. ایمان اور جہاد کا پیشرو:

(أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ)[2]

ترجمہ: کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد الحرام کی آبادی کو اس کا جیسا سمجھ لیا ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور راہ خدا میں جہاد کرتا ہے. ہر گز یہ دونوں اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہو سکتے اور اللہ ظالم قوم کی ہدایت نہیں کرتا ہے.

اس آیت کا نام آیہ سقایت یا آیہ مفاخرہ ہے. اس کی شان نزول جس پر شیعہ اور تقریبا تمام سنی مفسرین کو اتفاق ہے، کچھ یوں ہے کہ ایک دن قریش کے بزرگوں میں سے طلحہ بن شیبہ یا شیبہ اور عباس بن عبدالمطلب آپس میں گفتگو کر رہے تھے جس میں ہر ایک دوسرے پر اپنی فضیلت بیان کر رہا تھا. عباس نے کہا: مجھے وہ مقام و مرتبہ حاصل ہے جو کسی اور کے حصے میں نہیں آیا یعنی حاجیوں کو پانی پلانا. جواب میں شیبہ نے کہا: میرے پاس خانہ خدا کی چابی ہے اور میں اس گھر کا معمار ہوں.

۱۔ مزید معلومات کے لئے دیکھئے علامہ امینی کی ڈائری، مقالہ "حسین منی وانا من الحسین" استاد محمد باقر بہبودی

۲۔ التوبہ، ۱۹

اسی دوران حضرت علی علیہ السلام کا وہاں سے گزر ہوا. جب آپ علیہ السلام کو واقعے کا علم ہوا، آپ علیہ السلام نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "مجھے تمہارے سامنے کہتے ہوئے حیا آتی ہے، لیکن پھر بھی یہ بتا دوں کہ اس چھوٹی سی عمر میں مجھے وہ فخر حاصل ہے جس سے تم دونوں بے بہرہ ہو۔

"انہوں نے پوچھا: "کیسا فخر؟" امام علی علیہ السلام نے فرمایا: "میں نے تلوار کے ساتھ تمہارے خلاف جہاد کیا ہے تاکہ تم خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئو". [1] ایک اور روایت کے مطابق جب علی علیہ السلام نے ان دونوں کو بحث کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: "مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہے ہو، میں نے تم سے اور تمام لوگوں سے پہلے چھ مہینے اس قبلے کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی ہے اور میں صاحب جہاد ہوں." [2] روایت ایسے آگے بڑھتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی بات سن کر عباس غصے میں آگئے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جاکر پورا واقعہ سناڈالا. پیغمبر صلی االلہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو بلا بھیجا اور ان سے اس بارے میں چند سوالات پوچھے. اسی وقت جبرئیل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے: "کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد الحرام کی آبادی کو اس کا جیسا سمجھ لیا ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور راہ خدا میں جہاد کرتا ہے. ہر گز یہ دونوں اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہو سکتے اور

۱۔ مجمع البیان، ۵/۲۳؛ شواہد التنزیل سے منقول

۲۔ ایضاً

اللہ ظالم قوم کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔" اگلی آیت میں خداوند فرماتے ہیں: "بے شک جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے ہجرت کی اور راہ خدا میں جان و مال سے جہاد کیا وہ اللہ کے نزدیک عظیم درجے کے مالک ہیں اور در حقیقت وہی کامیاب بھی ہیں"[1]

۹. پہلی دعوت میں وصی کا تعین:

(وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ)[2]

ترجمہ: اور پیغمبر آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے۔

تشریح: معتبر تاریخوں کے مطابق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین سال تک ڈھکے چھپے انداز میں اسلام کی تبلیغ فرماتے رہے، لیکن 'وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ' کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوا کہ اعلانیہ طور پر اپنے خاندان والوں کی دعوت کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خاندان والوں کی دعوت کی اور چند بار ان کی دعوت کرنے کے بعد اپنا مقصد بیان فرمایا۔

اہل سنت کے ایک بہت بڑے مورخ طبری نے حضرت علی علیہ السلام کی زبانی ــ جنہوں نے خود اس واقعے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ــ اس واقعے کا بیان کچھ یوں لکھا ہے:

۱۔ التوبہ، ۲۰؛ دیکھئے تفسیر القرآن، ۲/۲۴۱؛ اسباب النزول واحدی ذیل آیہ ۱۹ توبہ

۲۔ الشعراء، ۲۱۴

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجمع میں شامل لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میں تمہارے لئے دنیا اور آخرت کی خیر وبرکت لایا ہوں اور خداوند تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم لوگوں کو اس عظیم ہستی کی طرف بلائوں. پس تم میں سے کون اس راہ میں میری مدد کرے گا اور تمہارے بیچ میرا بھائی، وصی اور جانشین ہوگا؟.

علی علیہ السلام مزید فرماتے ہیں:

"پیغمبرؐ کے اقارب نے آپؐ سے منہ پھیر لیا. لیکن میں جو ان کے درمیان سب سے کم سن اور چھوٹا تھا، اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا: اے خدا کے پیغمبرؐ! میں اس کام میں آپ کا مددگار اور وصی بنوں گا. اس موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے کاندھے پے ہاتھ رکھا اور مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: یہ شخص تمہارے درمیان میرا بھائی، وصی اور خلیفہ ہے. اس کی بات سنو اور اطاعت کرو. اس موقع پر مجمع میں شامل لوگ جو ہنس رہے تھے اپنی جگہ سے اٹھے اور ابوطالب علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: تمہیں اپنے بیٹے کا حکم ماننے اور اس کی پیروی کرنے کا حکم دیا جارہا ہے!"[1]

مندرجہ بالا واقعہ ایک معروف واقعہ ہے جس کا ذکر اہل سنت کی اکثر کتابوں میں کم وبیش تبدیلیوں کے ساتھ ہوا ہے۔

تاریخ طبری میں اسی طرح کی روایات میں سے ایک روایت کا بیان ہوا ہے کہ ایک دن کسی نے علی (علیہ السلام) سے سوال کیا:

۱۔ تاریخ طبری، ۲/۳۲۱، مجمع البیان، ۷/۳۲۲

"اے امیر المومنین! آپ علیہ السلام کس طرح اپنے چچازاد بھائی ـ حضرت محمدؐ ـ کے وارث بنے جبکہ آپ علیہ السلام کے چچا عباس بھی آپ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وراثت کا دعوی نہ کرسکے؟

علی علیہ السلام نے اس شخص کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت اسلام کے آشکار ہونے اور اقارب پیغمبر صلی االلہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان اپنے تعارف کا واقعہ بیان فرمایا. پھر فرمایا کہ یہی وجہ تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد میرے چچا عباس کی بجائے میں **(علی)** ان کا وارث بنا.[1]

مندرجہ بالا روایت پر غور کرنے کے بعد دو اہم نکات سمجھ میں آشنائی ہو جاتی ہے:

۱. پیغمبرؐ کے عزیز و اقارب نے ان کی دعوت اسلام کو پائدار اور کامیاب دعوت کے بجائے ایک انتہائی زود گذر اور ناپائدار دعوت سمجھی. اگر انہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس راہ میں کامیابیوں کا ذرہ بھر بھی علم ہوتا تو شاید اپنی قوم اور قبیلے کے مفاد کے تحفظ اور مستقبل بینی کے پیش نظر ان میں سے چند ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آتے.

۲. حضرت علی علیہ السلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھائی، وصی اور جانشین کے طور پر تعارف کا خیال شروع ہی سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توجہ کا مرکز تھا. اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اپنے عزیز و اقارب کی دعوت کا اصل مقصد نہ صرف

۱۔ تاریخ طبری، ۲/۳۲۲

انہیں دین کی طرف بلانا تھا بلکہ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس موقع پر انہیں مستقبل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین یعنی حضرت علی علیہ السلام سے آگاہ کیا جائے.

۱۰ ــ قرآن حکیم میں اہل بیتؑ کا تذکرہ:

(إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا)[1]

ترجمہ: بس اللہ کا ارادہ یہ ہے اے اہل بیت کہ تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے.

تشریح و توضیح: اس آیت کا مقصد بلاشک و تردید اہل بیت علیہم السلام کی پاکیزگی کا ثبوت فراہم کرنا ہے کیونکہ آیت میں "رجس" کے مطلب روحانی و فکری آلودگی ہیں، نہ کہ جسمانی اور ظاہری آلودگی. کیونکہ جسمانی آلودگی دور کرنا تو ہر انسان کے بس کی بات ہوتی ہے اور اس میں خدائی ارادے کی مداخلت کی، وہ بھی "انما" کی قید کے ساتھ ، قطعاً ضرورت نہیں.

اس آیہ شریفہ میں اہل بیت پیغمبرؐ کے نام سے ایک خاص گروہ کے بارے میں خداوند متعال کے ارادے کا ذکر ہوا ہے. اس آیت میں اہم ترین بحث اہل بیت کے مصداق لوگوں کا تعین ہے کہ یقیناً اس زمانے میں علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے علاوہ اور کوئی نہ تھا.

---

۱ ـ الاحزاب، ۳۳

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ چونکہ سورہ احزاب کی مذکورہ آیت سے پہلے اور بعد میں حضورؐ کی ازواج کا ذکر ہوا ہے اس لئے اہل بیت سے مراد وہی عورتیں ہیں اور آیت میں ان کی پاکیزگی بیان ہوئی ہے. لیکن یہ تصور مختلف دلائل کی بناپر صحیح نہیں. مثلاً اہل سنت کی کتابوں میں وہ بھی رسول اللہؐ کی ازواج کی زبانی بیان ہونے والی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت صرف علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے.

ترمذی اپنی کتاب سنن میں ام سلمی سے روایت کرتے ہیں کہ ام سلمی کہتی ہے: آیہ تطہیر میرے گھر میں نازل ہوئی جس کے نزول کے بعد پیغمبرؐ نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو بلا بھیجا، انہیں ایک عبا کے نیچے جمع کیا اور پھر فرمایا: "اے پروردگار! یہ میرے اہل بیتؑ ہیں، رجس اور پلیدی کو ان سے دور کر اور انہیں ہر طرح سے پاک کر." میں (ام سلمی) نے کہا: "یا رسول اللہؐ! کیا میں ان میں سے ہوں؟" رسول اللہ نے فرمایا: "اپنی جگہ رہو کہ تمہاری عاقبت اچھی ہے."[1]

ترمذی ایک اور روایت میں انس بن مالک سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "(آیہ تطہیر کے نزول کے بعد) چھ مہینے تک رسول اللہؐ نماز صبح کے وقت جناب فاطمہؑ کے گھر کے قریب سے گزرتے اور انہیں اس انداز میں نماز کے لئے آواز دیتے: "الصلاۃ یا اھل البیت انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطہیرا"[2]

۱۔ ایضاً، ۵/۳۲۸ اور ۶۲۲ اور ۶۵۷

۲۔ سنن ترمذی، ۵/۳۲۸

اس عمل سے رسول اللہؐ کا مقصد یہ تھا کہ سب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ "اہل بیت" سے مراد علی علیہ السلام، فاطمہ علیہا السلام، حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور نہیں.

۱۱. اجر رسالت:

"قُل لَا اَسئَلُکُم عَلَیہِ اَجراً اِلّا المَوَدَّۃَ فِی القُربیٰ"

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت کا اجر نہیں چاہتا علاوہ اس کے کہ میرے اقرباء سے محبت کرو.

ہم اس آیت کی توضیح و تشریح دو سوالات کی روشنی میں کرتے ہیں:

- کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی جیسے عظیم اور مشکل کام کے لئے اجرت کے طلبگار تھے؟
- اگر یوں فرض کر لیا جائے تو کیا یہ انسانوں کے بس کی بات ہے کہ وہ پیغمبروں کی اجرت دے سکیں؟

قرآنی آیات سے رجوع کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پوچھے جانے والے دونوں سوالات کے جواب منفی یعنی "نہیں" کی صورت میں ملیں گے. سورہ شعراء میں پانچ پیغمبروں کی زبانی یوں بیان ہوا ہے:

وَمَا أَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِیَ إِلَّا عَلیٰ رَبِّ الْعَالَمِینَ[۱]

۱۔ الشعراء، ۱۰۹؛ حضرت نوح کی زبانی، ۱۲۷ حضرت ہود کی زبانی، ۱۴۵؛ حضرت صالح کی زبانی، ۱۶۴؛ حضرت لوط کی زبانی اور ۱۸۰، حضرت شعیب کی زبانی

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو پیامبران الٰہی کسی اجر یا اجرت – بالخصوص مادی اجرت –کے طلبگار تھے اور نہ ہی انسان پیغمبروں کو اجر یا اجرت دینے پر قادر ہیں.

ایک اور آیت میں ہے کہ: "آپ کہہ دیجئے کہ میں تم لوگوں سے کچھ نہیں چاہتا مگر یہ کہ جو چاہے وہ اپنے پروردگار کا راستہ اختیار کرلے.[1]

اس آیت میں پیغمبروں کا اجر یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کمالات تک پہنچنے کے لئے صحیح راستے کا انتخاب کرے.

سورہ شوری میں ایک آیت ایسی ہے جس میں لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اجر رسالت ادا کریں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقارب کے ساتھ دوستی اور مودت کے سوا کچھ نہیں اور خداوند عالم نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ تمام لوگوں کو اس بات سے آگاہ کریں.

لیکن یہاں سوال اٹھتا ہے کہ سورہ شوری میں "قربی" کے مصداق کون لوگ ہیں؟

ابن عباس سے ایک روایت کرتے ہوئے ابن کثیر کہتے ہیں کہ "قربی" کے مصداق قریش ہیں، اور پھر اپنی بات کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قریش میں کوئی ایسا خاندان نہیں تھا، مگر وہ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ربط ہو.[2] ابن کثیر خود "قربی" کو بطور مصدر استعمال کرتے ہوئے آیت کی تفسیر کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

۱۔ الفرقان، ۵۸

۲۔ تفسیر القرآن العظیم، ۴/۱۲۱

"کہو اے پیغمبر! میں اپنی رسالت کے لئے تم لوگوں سے کسی اجر کا طالب نہیں لیکن اس قرابت کے سبب جو میرے اور تمہارے درمیان ہے، مجھے آزار مت پہنچاؤ۔"[1]

اس کے برعکس بعض مفسرین جیسے زمخشری اور فخر رازی نے "القربی" کا مطلب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاندان لیا ہے اور علی علیہ السلام، فاطمہ علیہا السلام، حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کو اس لفظ کا مصداق بیان کیا ہے۔

زمخشری لکھتے ہیں: روایت میں ہے کہ جب "قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی" کی آیت نازل ہوئی تو اصحاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ اقارب کون لوگ ہیں جن کی مودت ہم پر واجب قرار دی گئی ہے؟

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: علی علیہ السلام، فاطمہ علیہا السلام اور ان کے دو بیٹے۔"

اس کے بعد زمخشری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مفصل حدیث جس میں آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوستی کا ذکر ہوا ہے، بیان کی ہے جو کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے:

"قال رسول اللہ: من مات علی حب آل محمد مات شہیداً، الا ومن مات علی حب آل محمد مات مغفوراً لہ..."[2]

۱۔ ایضا، ۴/۱۲۱

۲۔ الکشاف ۴/۲۲۰

فخر رازی انہی مفاہیم کے ذکر کے بعد کہتے ہیں: یہ زمخشری کا عقیدہ تھا. لیکن میرا ماننا ہے: آل محمد ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کا سلسلہ دوبارہ رسول اللہؐ تک پہنچتا ہے اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ فاطمہ علیہا السلام، علی علیہ السلام، حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام وہ لوگ ہیں جن کا تعلق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے زیادہ تھا. اسی لئے "آل" کے مصداق دراصل یہی لوگ ہیں. جہاں تک آل محمد علیہم السلام کی عظمت و بزرگی کا سوال ہے تو یہی کافی ہے کہ "اولاً تو یہ ــ علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ ــ خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب افراد تھے اس پر مزید یہ کہ ان کی دوستی امت مسلمہ پر واجب قرار دی گئی۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے ناموں کو تشہد میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے پہلو میں جگہ ملی ہے: " اللھم صلی علی محمد وآل محمد " یہ بات خود بخود ان کی دوستی پر دلالت کرتی ہے.[1]

۱۲. راہ خدا میں خرچ کرنے کی مخصوص فضیلت:

"یا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِذا ناجَیْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَیْنَ یَدَیْ نَجْواکُمْ صَدَقَةً ذلِکَ خَیْرٌ لَکُمْ وَ أَطْهَرُ فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِیمٌ"[2]

۱۔ مفاتیح الغیب، ۲۷/۱۶۶

۲۔ المجادلہ، ۱۲

ترجمہ: ایمان والو جب بھی رسول سے کوئی راز کی بات کرو تو پہلے صدقہ نکال دو کہ یہی تمہارے حق میں میں بہتری اور پاکیزگی کی بات ہے. پھر اگر صدقہ ممکن نہ ہو تو خدا بہت بخشنے والا اور مہربان ہے.

اس آیت کا نام آیہ نجوا ہے. اکثر شیعہ اور سنی مفسرین کے مطابق: اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے چند دولتمند لوگ وقت بے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے حاضر ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نجوا (راز کی بات) کرتے جس سے نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وقت ضائع ہوتا بلکہ اس عمل سے وہاں موجود فقراء بھی پریشان ہو جاتے. تب آیہ نجوا نازل ہوئی جس میں بیان کیا گیا کہ دولتمند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خصوصی ملاقات سے قبل فقیروں میں صدقہ بانٹیں لیکن امراء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنی خصوصی ملاقاتوں سے باز آئے اور صدقہ بھی نہیں دیا.

پھر ایک اور آیت نازل ہوئی کہ:

"ااشفقتم ان تقدموا بین یدی نجواکم صدقات..."

یعنی: کیا تم ڈر گئے (کہ کہیں فقیر نہ ہو جاؤ) جو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرگوشی (نجوا) کرنا چھوڑ دیا؟" اس آیت کے ساتھ ہی پہلی آیت منسوخ ہو گئی.[1]

آیہ نجوا سے متعلق اہم ترین بات یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام وہ واحد انسان تھے جنہوں نے اس آیت پر عمل کیا. طبری حضرت علی علیہ

۱۔ مجمع البیان، ۹/۲۵۲؛ مفاتیح الغیب، ۲۹/۲۷۱؛ جامع البیان، ۲۷/۱۵

السلام کی زبانی رقمطراز ہیں کہ علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "خداوند تعالی کی کتاب (قرآن حکیم) میں ایک ایسی آیت ہے جس پر نہ کسی نے مجھ سے پہلے عمل کیا اور نہ میرے بعد کرے گا اور وہ یوں کہ میرے پاس ایک دینار تھا جسے دے کر میں نے دس درہم لئے اور جب کبھی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نجوا کرتا، ان میں سے ایک درہم کا صدقہ نکال دیا کرتا۔"[1]

اس حدیث کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ آیہ نجوا پر عمل کرنا امام علیؑ کے مخصوص فضائل میں شمار ہوتا تھا جس کے بارے میں اس آیت کے نزول کے وقت ہی سے دوسرے صحابہ بھی جانتے تھے. اہل سنت کی اکثر تفاسیر میں عبداللہ بن عمر سے روایت ہوئی ہے کہ وہ کہتے ہیں: "علیؑ کو تین فضیلتیں حاصل تھیں کہ اگر ان میں سے ایک مجھے ملتی تو میرے لئے سرخ اونٹوں سے زیادہ بہتر تھا اور وہ تین فضیلتیں تھیں: علیؑ کی حضرت فاطمہ کے ساتھ شادی، خیبر کے دن آپ علیہ السلام کو پرچم کا عطا ہو جانا اور آیہ نجوا.[2]

اس کے باوجود اہل سنت سے تعلق رکھنے والے چند متعصب لوگوں کی کوشش رہی ہے کہ علیؑ کی اس فضیلت کو دھندلا کردیں. اسی گروہ میں سے ایک یوں لکھتا ہے: اگر صحابہ نے صدقہ نہیں نکالا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اس کام کو ضروری نہیں سمجھا، یا ان کے پاس کافی وقت نہیں تھا، یا ان کا خیال ہوگا کہ یہ عمل فقیروں کی ناراضی اور

۱۔ تفسیر طبری، ۱۵/۲۷؛ نیز: الدر المنثور، ۶/۱۸۵؛ معالم التنزیل، ۷/۲۴؛ فتح القدیر، ۵/۱۹۱

۲۔ اسد الغابہ، ۴/۲۶؛ مجمع البیان، ۹/۲۵۲؛ معالم التنزیل، ۷/۴۴

امیروں کی وحشت کا سبب بن سکتا ہے. اس لئے یہ عمل علیؑ کی فضیلت اور دوسروں سے اس فضیلت کے چھن جانے کا باعث نہیں کہلایا جاسکتا[1]

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان متعصب مفسرین نے دوسری آیت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جس میں خداوند متعال نے ایسے لوگوں کی سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: کیا تم نجوا سے قبل صدقات تقسیم کرنے کے باعث (**فقیر ہونے سے**) ڈر گئے؟" اس کے علاوہ اس آیت کی ذیل میں توبہ کا ذکر آیا ہے کہ: پیغمبرؐ سے نجوا کرنے سے پہلے صدقہ دینا ایک مطلوب امر تھا جس سے دریغ کی صورت میں کسی سرزنش یا توبہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی."[2]

بہر حال حضرت علی علیہ السلام کے آیہ نجوا پر عمل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ علیہ السلام کو حضورؐ کے نزدیک ایک خاص مقام حاصل تھا جس کی بنا پر آپ علیہ السلام حضور سے ملاقات کے دوران ان کے علم و دانش سے استفادہ فرمایا کرتے تھے. خود اس بارے میں فرماتے ہیں:

کنت اذا سالت رسول اللہ اعطانی واذا سکت ابتدانی"[3]

ترجمہ: جب کبھی میں رسول اللہؐ سے کچھ مانگتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ چیز مجھے عطا فرماتے اور جب میں خاموش ہو جاتا تو آپؐ اپنی باتوں کا آغاز فرماتے. اسی لئے آیہ نجوا بھی حضورؐ اور حضرت علیؑ کے درمیان فاصلہ پیدا نہ کرسکے اور علیؑ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ

۱۔ مفاتیح الغیب، ۲۹/۲۷۲

۲۔ البیان، ۲۷۹؛ تفسیر نمونہ، ۲۳/۴۵۳

۳۔ سنن ترمذی، ۵/۵۹۵ اور ۵۹۸

وسلم سے ملاقات کے شوق نے آپؐ کو آخر تک آیہ نجوا پر عمل کرنے کا پابند رکھا.

۱۳. قربانی کی عظمت:

"یُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَیَخافُونَ یَوْماً کانَ شَرُّهُ مُسْتَطیراً. وَیُطْعِمُونَ الطَّعامَ عَلی حُبِّهِ مِسْکیناً وَیَتیماً وَأَسیراً "[1]

ترجمہ: یہ بندے نذر کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے. یہ اس کی محبت میں یتیم، مسکین اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں.

توضیح و تشریح: سورہ انسان میں ایک ایسا مقام ہے (آیت نمبر ۵ سے آیت نمبر ۲۲تک) جس میں خداوند تعالی نے امت مسلمہ کے نیک فطرت انسانوں کی تعریف فرمائی ہے. ان آیات میں بیان ہوا ہے کہ ان نیک فطرت انسانوں نے خدا کی راہ میں نذرونیاز بانٹنے کا اپنا وعدہ پورا کیا اور کھانے کی طرف میلان کے باوجود ہمیشہ کسی نہ کسی مسکین، یتیم اور اسیر کو اپنی خوراک میں حصہ دار ٹھہرایا. یہاں ان آیات کے پس منظر میں ہر سطح کے قاری کے لئے کچھ سوالات جنم لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جیسے:

۱. یہ نیک فطرت لوگ کون تھے؟ مستند روایات و تواریخ کن لوگوں کے نام لیتی ہیں؟

۱۔ الانسان، ۸-۷

۲. نذر و نیاز کا پس منظر کیا تھا اور نذر و نیاز بانٹنے کا وعدہ کیسے پورا ہوا؟

۳. اس نذر و نیاز کے ثابت ہونے کی زمانی و مکانی حیثیت کیا ہے؟ کیا ان آیات میں ایک واقعی امر کی بات ہوئی ہے یا صرف ایک فرضی اور خیالی حادثے کا ذکر ہوا ہے؟

جب ہم ان سوالات کے جوابات تک پہنچنے کے لئے تاریخی ادوار میں جھانکتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ:

- یہ نیک فطرت ہستیاں علی علیہ السلام، فاطمہ علیہ السلام، حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کے سوا کوئی اور نہیں.
- نذر بانٹنے کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ نیک فطرت ہستیوں (جناب فاطمہ زہرا اور حضرت علی) نے حسنینؑ کی بیماری کی وجہ سے تین دن تک روزے رکھے اور یہ نذر انہوں نے رسول اللہؐ کے حکم کی تعمیل میں مانی.
- اس نذر کا واقعہ مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری دنوں میں رونما ہوا. نذر کے پہلے دن کے اختتام پر ایک سائل نے ان نیک فطرت لوگوں کے دروازے پر آکر صدا لگائی. اہل بیت نے (جو خود بمشکل گزر اوقات کرتے تھے) اپنا مختصر کھانا اس فقیر کو دے دیا اور پانی سے اپنا روزہ کھولا. دوسرے دن ایک یتیم آیا اور کھانا کھا کر چلا گیا اور تیسرے دن ایک قیدی

نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ان نیک فطرت انسانوں نے ایک بار پھر قربانی کا مظاہرہ کیا.

اس عظیم حادثے کے اختتام پر خداوند متعال نے "ان الابرار یشربون" کی آیت کے نزول کے ساتھ اس واقعی حادثے کو قیامت تک محفوظ کر لیا. پس یہ کوئی فرضی اور خیالی واقعہ نہ تھا جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں.[1] غالباً اہل سنت کے مفسرین نے اپنی تفاسیر میں یہ سرگذشت بیان کی ہے.[2] بزرگان شیعہ جیسے طبرسی[3]، علامہ مجلسی[4]، علامہ امینی[5] اور علامہ طباطبائی[6] نے اپنی کتابوں میں اس واقعے کی حقیقت سے متعلق مضبوط دلائل پیش کئے ہیں.

۱۴. بہترین مخلوق:

"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ"[7]

ترجمہ: اور بے شک جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال کئے ہیں، وہ بہترین خلائق ہیں.

۱۔ جیسے جامع الاحکام میں قرطبی اور البحر المحیط میں ابو حیان توحیدی

۲۔ الکشاف، ۴/۶۷۰، مفاتیح الغیب، ۳۰/۲۴۴؛ فتح القدیر، ۵/۳۴۹؛ انوار التنزیل، ۲/۵۵۲

۳۔ مجمع البیان، ۱۱۰/۶۱۱ سے ۶۱۴ تک

۴۔ بحار الانوار، ۳۵/۲۳۷؛ عنوان: فی نزول سورہ ہل اتی

۵۔ الغدیر، ۵/۱۸۹ اور ۲۸۴

۶۔ المیزان، ۲۰/۳۶۳ سے ۳۷۰ تک

۷۔ البینہ، ۷

اس آیت میں **"خیر البریہ"** کے معنی خدا کی بہترین مخلوق کے ہیں. شیعہ کتابوں اور بہت سی اہل سنت کی تفاسیر میں مذکور روایات کی روشنی میں "خیر البریہ" کے مصداق علی علیہ السلام اور شیعیان علی ہیں اور یہ تعریف رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے اور اس آیت کے نزول کے وسیلے سے ثابت ہوئی ہے.

جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں: ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ علی علیہ السلام آئے.

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مجھے اس کی قسم جس کی عظیم قدرت کی مٹھی میں میری جان ہے کہ علی علیہ السلام اور ان کے پیروکار (شیعیان) قیامت تک آزاد ہیں. "

اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: "اِنّ الَّذِینَ آمنُوا وَعَمِلوُا الصَّالِحات اولئِک هُمْ خَیْرُ الْبرِیّة" اس دن کے بعد جب بھی صحابہ علی علیہ السلام کو دیکھتے تو کہتے "جاء خیر البریة" یعنی: سچ ہے کہ خیر البریہ آئے.[۱]

مزید یہ کہ آیہ خیر البریہ اور علیؑ اور شیعیان علی پر اس کے منطبق ہونے سے متعلق روایات رسولؐ کے کئی اصحاب جیسے عباس، حذیفہ اور عائشہ سے منقول ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ اپنے معاصرین میں رسول خدا کے بعد سب سے بہترین مخلوق تھے اور فضیلت اور تقوی کے معاملے میں کوئی آپؑ کی برابری کا دعوے دار نہ تھا. شیعہ علیؑ یعنی علیؑ) کے پیروکار کی اصطلاح پہلی بار جناب رسول

۱۔ فتح القدیر، ۵/۴۷۷؛ الدر المنثور، ۶/۳۷۹؛ مجمع البیان، ۱۰؛ الغدیر، ۲/۵۷؛ المیزان، ۲۰/۷۵۸؛ المراجعات، ۹۶؛ اور تعلیقات کا ایک حصہ، ۶۲، رقم ۱۱۱

اکرمؐ نے استعمال فرمائی جس نے رفتہ رفتہ علیؑ کے پیروکاروں کے لئے اسم خاص کی حیثیت اختیار کرلی.

۱۵۔ اولاد کثیر اور بقائے نسل:

" إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ . فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ. إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ "[1]

ترجمہ: بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا ہے. لہٰذا آپ اپنے رب کے لئے نماز پڑھیں اور قربانی دیں. یقیناً آپ کا دشمن بے اولاد رہے گا.

تشریح: طبرسی اس آیت کی شان نزول کچھ یوں بیان کرتے ہیں: ایک دن عاص بن وائل سہمی نے مسجد الحرام میں رسول خدا سے ملاقات اور گفتگو کی. ملاقات کے بعد بزرگان قریش میں سے ایک گروہ اس سے ملا اور پوچھا: کس سے باتیں کر رہے تھے؟ اس نے جواب دیا: میں ابتر سے باتیں کر رہا تھا. "ابتر" سے اس کی مراد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے کیونکہ انہی دنوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے عبداللہ نے دنیا سے رحلت کی تھی اور عرب میں ایسے شخص جس کے کوئی اولاد نہ ہوتی، کو ابتر کہہ کر بلاتے تھے. اس موقع پر سورہ کوثر نازل ہوا جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوثر اور دوسری نعمتوں کی خوشخبری دی گئی.[2]

اکثر شیعہ اور سنی مفسرین نے اس آیت کی شان نزول کا ذکر اپنی

۱۔ الکوثر، ۱سے ۳تک

۲۔ مجمع البیان، ۱۰/۸۳۶

کتابوں میں کیا ہے. ہر چند لفظ "کوثر" کی تعبیر و تفسیر پر مفسرین کے درمیان شدید اختلاف نظر پایا جاتا ہے. کوثر کے معنی خیر کثیر کے ہیں. اس کے علاوہ اس لفظ کے اور بھی کئی معانی ہیں جیسے قرآن، کثیر علم، بہشت کی ایک نہر، نبوت اور پیغمبری، نسل اور اولاد، شفاعت کا مقام وغیرہ. لیکن اوپر بیان ہونے والی شان نزول کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹوں کی وفات پر خوش ہوتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابتر کا خطاب دیا، خدا تعالی نے ان کے اس لفظ کی تردید کرتے ہوئے ان کے صاحب کوثر ہونے کا اعلان فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ اس عظیم نعمت کے حصول کے بعد نماز ادا فرمائیں اور اونٹ کی قربانی دیں. "اعطینا" کے ادبی استعمال کو دیکھتے ہوئے جس میں لازما واقع ہونے والے مضارع کا مفہوم پایا جاتا ہے، ہمیں دو غیبی باتوں کا علم ہوتا ہے:

- ہم تمہیں خیر کثیر منجملہ نسل و ذریت فراواں عطا کریں گے تاکہ تم ابتر اور بغیر نسل نہ کہلاسکو.
- تمہیں برا کہنے والا ابتر النسل ہوگا.

جیسا کہ ہم بعد میں دیکھتے ہیں کہ خدا نے اپنے دونوں کئے ہوئے وعدے پورے کئے اور حضرت فاطمہؑ کے توسط سے پیغمبرؐ کی نسل پوری دنیا میں پھیلادی. ساتھ ہی آپؐ کے دشمنوں کی نسل سے کوئی باقی نہ رہا یا اگر رہا بھی تو نامعلوم ہی رہا.

اہل سنت کے مفسرین میں سے فخر رازی نے جہاں کوثر کے ایک

سے زیادہ مصداق کا ذکر کیا ہے، وہیں ایک مصداق کے بیان میں سدی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: عربوں میں یہ رسم تھی کہ اگر کسی کا بیٹا فوت ہو جائے تو اسے ابتر بلاتے تھے. چونکہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹوں قاسم اور عبداللہ اور مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اور فرزند ابراہیم کی وفات ہوئی، اس لئے وہ کہنے لگے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابتر ہیں اور ان کا کوئی جانشین نہیں. لیکن خدا نے اس سورہ کے نزول کے ساتھ واضح کیا اصل میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن ابتر تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل قیامت تک بڑھتی رہے گی.[1]

آخر میں یاد دلاتا چلوں کہ قرآن کریم میں اور بھی بہت سی ایسی آیات ہیں جو سبب نزول یا معتبر تفاسیر کی روشنی میں اہل بیت علیہا السلام سے مطابقت رکھتی ہیں. لیکن چونکہ اس باب میں ایجاز واختصار کا بہت خیال رکھا گیا ہے اس لئے ہم یہاں صرف ۱۵ آیات ہی کا ذکر کرسکے ہیں. شائقین مزید معلومات کے لئے تفاسیر روایات یا ان مخصوص کتابوں (جن میں اہل بیت کی شان میں نازل ہونے والی آیات جمع کی گئی ہیں) سے رجوع کریں.[2]

۱۔ مفاتیح الغیب، ۳۲/۱۳۳

۲۔ دیکھئے سید شرف الدین نجفی (دسویں صدی کے عالم) کی کتاب تاویل الظاہرۃ فی فضایل العترۃ الطاہرۃ، ڈاکٹر ولی اللہ نقی پور کی کتاب قرآن میں اہل بیت (علیہ السلام) کی شخصیات کا مطالعہ قرآنی انداز سے۔